# شکیلؔ بدایونی کی ادبی حیثیت

**محمد کیف فرشوری بدایونی**
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، موبائل: 9897642655

شکیل احمد شکیلؔ بدایونی ۳؍اگست ۱۹۱۶ء مطابق ۳؍شوال ۱۳۳۴ھ کو بدایوں کے ایک علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت مولانا ضیاالقادری کے زیر سایہ ہوئی۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے ہی تھا، اس لیے بڑے ہو کر مولانا سے ہی شرف تلمذ حاصل کیا۔

اپنے ہم عصروں رازؔ (ف ۱۹۸۲ء)، ساحرؔ (ف ۱۹۸۰ء)، مجروحؔ (ف ۲۰۰۰ء) اور خمارؔ (ف ۱۹۹۹ء) کے بیچ شکیلؔ کی شاعری کی عظمت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے ہنگاموں کے دوران جبکہ غزل کی چاروں طرف مخالفتیں ہو رہی تھیں، اس نازک سے دور میں شکیلؔ نے نہ صرف یہ کہ غزل کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا بلکہ اس کو خوب برتا اور اس کے گیسو بھی سنوارے۔ وہ کلاسیکی غزل کے شیدائی بن کر سامنے آئے۔ اِس سلسلے میں خمارؔ کا بھی اہم کردار رہا۔

شکیلؔ کے ان چاروں ہم عمروں کا اردو ادب میں اپنا الگ الگ مقام ہے۔ رازؔ خالص حسن و عشق کے نغمے گاتے ہیں۔ ساحرؔ ترقی پسندوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ مجروحؔ وہ پہلے اور واحد شاعر ہیں کہ جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بقیہ شعرا کے مقابلے میں غزل کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ خمارؔ نے کلاسیکی غزل کا دامن تھام کر حسن و عشق کے نئے نئے مضامین کو منفرد لب و لہجہ کے ساتھ ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ شکیلؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کلاسیکی غزل کے گیسو سنوارے بلکہ استاد وقت جناب جگرؔ مرادآبادی کے اثر کو اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ قبول کیا۔ جگرؔ کی رندی، سرمستی و سرشاری ان کے یہاں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہی مے خواری و مے نوشی کے مضامین جو جگرؔ کے کلام کا خاصہ ہیں شکیلؔ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے بھی زاہد و واعظ پر طنز کی بوچھار کی ہے اور جام و مینا کی باتیں ان کے یہاں بھی نظر آتی ہیں۔

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

اٹھا جو مینا بدست ساقی رہی نہ کچھ تاب ضبط باقی
تمام مے کش پکار اٹھے، یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے
پی شوق سے واعظ ارے کیا بات ہے ڈر کی
دوزخ ترے قبضے میں ہے جنت ترے گھر کی
زاہد کی مے کشی پہ تعجب نہ کیجیے
لاتی ہے رنگ فطرت آدم کبھی کبھی
یہ اعلان تقدس اور یہ میخواریاں واعظ
تجھے منجملہ ارباب فن کہنا ہی پڑتا ہے
میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم، تری زندگی کنارا
اترا وہ خمار بادۂ غم رندوں کو ہوا ادراک ستم
کھلنے کو ہے میخانے کا بھرم اب پیر مغاں کی خیر نہیں

اس قسم کے اشعار کی اُن کے یہاں بھرمار ہے۔ شکیلؔ نے نہ صرف جگرؔ کے رنگ کو قبول کیا بلکہ اپنی شاعری میں کامیابی کے ساتھ برتا بھی۔ جگرؔ کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں فانیؔ و مومنؔ کا بھی اثر نمایاں ہے۔ وہ کلاسیکی غزل کے شیدائی ہیں، اسی لیے اپنے بزرگوں کے اثر کو قبول کرتے ہیں۔ حسن و عشق کے مضامین و مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ شکیلؔ سادہ مزاج تھے، انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کے لیے غزل کا انتخاب کیا۔ ان کی شخصیت کی یہی سادگی و صفائی ان کی غزل میں بھی پائی جاتی ہے۔ نغمگی ان کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ مشاعروں میں غزلیں اپنے مخصوص ترنم میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کی اسی رنگ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

غم جاناں، غم ہستی، غم حالات شکیلؔ
کیا کہوں کتنی بلائیں ہیں مری جان کے ساتھ
میں غم جہاں سے نڈھال ہوں کہ سراپا حزن و ملال ہوں
جو لکھے ہیں میرے نصیب میں وہ الم کسی کو خدا نہ دے

شکیلؔ عمر بھر غزل کے شیدائی رہے اور یہ میدان ان کا پسندیدہ تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

میں شاعر شباب رہوں گا سدا شکیلؔ
ڈھلنے لگی ہے عمر تو ڈھلنے بھی دیجیے
تفسیر دو عالم ہے شکیلؔ اپنا تغزل
میدان غزل چھوڑ کے ہم جا نہیں سکتے

شکیلؔ کے ہم عمروں میں ان کی دوسری امتیازی حیثیت یہ ہے کہ فلمی دنیا میں بھی ایک نغمہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ساحرؔ، مجروحؔ، خمارؔ اور شکیلؔ چاروں فلمی دنیا سے وابستہ رہے اور چاروں کا زمانہ بھی ایک ہی ہے۔ ان میں سے اگر ہم صرف ساحرؔ کی ہی بات کریں کیوں کہ وہ نغمہ نگاری کی دنیا میں بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح اپنے ایک گیت میں تاج محل کو بادشاہ وقت کا غرور و تکبر بتا دیا۔ فرماتے ہیں:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اب شکیلؔ کا لہجہ دیکھیے جب انھیں اس سلسلے میں موقع ملا تو کس طرح انھوں نے فرمایا:

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

یہ ہے ایک کھلے ذہن اور ایک بڑے فن کار کی خصوصیت۔ انھوں نے تاج محل کو غرور و گھمنڈ کی مثال نہیں بتایا بلکہ محبت کی ایک نشانی کے طور پر دیکھا اور یہی شکیلؔ کی عظمت ہے۔ شکیلؔ اپنے دور میں ایک مقبول غزل گو کی حیثیت رکھتے تھے اور اس وقت کے مشاعروں میں ان کی موجودگی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ اس کے باوجود شکیلؔ کو اردو شاعری میں وہ مقام نہیں مل سکا کہ جس کے وہ مستحق تھے۔ یہ سب ایک پروپیگنڈہ ہی تھا کہ ادبی دنیا سے انھیں نظر انداز کیا گیا۔ اس امر کا احساس خود شکیلؔ کو بھی تھا۔ انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے:

ہے ظلم شکیلؔ اہل سیاست کا یہ ورنہ
گنجائش تنقیص کہاں میری غزل میں

یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک نغمہ نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے، مگر ان کے ادبی کارناموں کی بھی تعداد کچھ کم نہیں ہے، مع ''نغمۂ فردوس'' (مذہبی شاعری) کے ان کے سات ادبی مجموعے ہیں، مثلاً رعنائیاں (۱۹۴۴ء)، نغمۂ فردوس (۱۹۴۸ء)، صنم و حرم (۱۹۵۰ء)، شبستاں (۱۹۵۸ء)، دور کوئی گائے (۶۱۔۱۹۶۰ء)، رنگینیاں (۱۹۶۱ء) اور آخری مجموعہ زیبائیاں (۱۹۸۶ء)۔ ان میں سے اگر ہم آخری مجموعے کو چھوڑ دیں کیوں کہ یہ ان کی حیات کے بعد منظر عام پر آیا، حالاں کہ یہ شائع ضرور شکیلؔ کی وفات کے بعد ہوا، مگر اس میں کلام وہی موجود ہے جس کو وہ پسند فرماتے تھے اور مشاعروں میں پڑھا کرتے تھے، جس کی بنا پر وہ ایک مقبول غزل گو شاعر تھے۔ شکیلؔ کا پہلا مجموعۂ کلام ''رعنائیاں'' ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ یہ وہی مجموعہ ہے کہ جس کا مقدمہ رئیس المتغزلین حضرت جگرؔ مرادآبادی (ف ۱۹۶۰ء) نے لکھا تھا۔ جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''شکیلؔ کو میں ان کے زمانۂ حصول تعلیم سے جانتا ہوں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے متعلم تھے۔ میری رندی و سرمستی کا شباب تھا..... برا شعر سن نہیں سکتا تھا..... شکیلؔ بحیثیت شاعر ابتدائی دور سے گزر رہے تھے۔ تاہم ان کے کلام نے مجھے اپنی جانب کھینچا۔ اگرچہ کلام میں خامیاں بھی ہوں گی، لیکن شعریت اور شعریت کے ساتھ ساتھ سلاست بیان بدرجۂ اتم موجود تھی..... شکیلؔ شاعر فطرت ہیں۔ شاعر کاریگر نہیں۔''[1]

اور آخری حصے میں لکھتے ہیں کہ ''اس طرح کے چند اشعار بھی اگر کوئی شخص زندگی بھر میں کہہ دے تو میں اسے صحیح معنوں میں شاعر تسلیم کرنے کو تیار ہوں''۔ آگے انھوں نے اپنی پسند کے اشعار نقل بھی کیے ہیں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ یہ شکیلؔ کے ابتدائی کلام کا مجموعہ ہے، ابھی وہ فلمی دنیا میں داخل بھی نہیں ہوئے ہیں اور جگرؔ فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ صحیح معنوں میں شاعر ہے جو اپنی پوری زندگی میں شکیلؔ کے ابتدائی کلام کی طرح اشعار کہہ دے۔ اب یہاں بات واضح ہے کہ شکیلؔ کا کلام ابتدائی دور میں ہی اِس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ اس نے جگرؔ مرادآبادی جیسے شاعر کو اپنی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ اِسی لیے جگرؔ کی نظروں میں ان کے کلام کی اہمیت تھی اور یہی وجہ ہے کہ جگرؔ نے اتنا بڑا دعویٰ کیا۔ یہاں ایک بات یہ بھی واضح ہے کہ شکیلؔ اپنے صرف ابتدائی کلام کی بنا پر ہماری اردو شاعری میں ایک ادبی شاعر کی حیثیت رکھتے تھے کیوں کہ یہ راقم الحروف کا خیال نہیں بلکہ رئیس المتغزلین حضرت جگرؔ مرادآبادی کے قول سے ثابت ہوتا ہے۔ اب وہ حضرات جو شکیلؔ کی فلمی دنیا کی شہرت کی بنا پر بغیر ان کے ادبی کلام کا مطالعہ کیے، ان پر صرف فلمی شاعر ہونے کی تہمت لگاتے ہیں، انھیں تعصب کو درکنار کر یا تو اپنی سوچ کو بدلنا پڑے گا یا پھر اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے پہلے جگرؔ کا مرتبہ کچھ کم کرنا ہوگا۔ راقم ان حضرات

سے یہی کہنا چاہے گا کہ ادبی جانبداری سے پرہیز کیجیے اور ایک خالق کو اس کی تخلیق کے عوض جو کچھ بھی اسے ملنا چاہیے، جس کا وہ مستحق ہے، حق دار ہے، اس کا حق ادا کیجیے اور اس کو وہ مرتبہ عطا کیجیے۔

معاملہ صرف جگرؔ تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس زمانے کے اہم بزرگ اساتذہ نے بھی شکیلؔ کے کلام کی عظمت کو قبول کیا ہے مثلاً پروفیسر رشید احمد صدیقی، شکیلؔ کے پہلے ہی مجموعے پر لکھی اپنی تقریظ میں تحریر فرماتے ہیں:

''غزل گوئی اس درجہ ''مقطر'' ہو چکی ہے کہ اس میں مزید کشید گی کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے اور اس طرح کی گنجائش نکال لینے کی صلاحیت شکیلؔ صاحب میں پائی جاتی ہے۔''[۲]

اسی طرح مولانا ماہرؔ القادری فرماتے ہیں:

''شکیلؔ کے بعض شعروں پر میری پلکیں بھی باوجود ضبط کرنے کے بھیگ کر رہی ہیں۔ شکیلؔ محسوس کر کے شعر کہتے ہیں اور یہی احساس شعر کے سانچے میں ڈھل کر ''سحر حلال'' بن جاتا ہے۔''[۳]

اور علامہ سیمابؔ اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''شکیلؔ صاحب بدایونی ان چند نوجوان شعرا میں سے ایک ہیں جنھیں میں مستقبل کا شاعر سمجھتا ہوں....اور آج میں دیکھتا ہوں کہ کوئی آل انڈیا مشاعرہ اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھا جاتا جب تک شکیلؔ اس میں نوا سنج نہ ہوں۔''[۴]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''.....اور ان کے کلام میں مشرقی جذبات، مشرقی روایات اور مشرقی فن شاعری کے تمام سامان اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جھلکتے اور چمکتے نظر آتے ہیں....وہ مشاعروں پر چھا جانے والے شاعر سحر نوا ہیں۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ان کی ساز آفرین آواز کی موجودہ ''داؤدیت'' باقی نہ رہے، لیکن ان کی بلندیٔ فکر، شگفتہ خیالی، تحلیل نفسی، متانت خیال، ژرف نگاہ ہی ہمیشہ ان کے کام اور کلام کے ساتھ وابستہ رہے گی اور یہی چیز میرے یقین میں ان کے مستقبل کی ضامن ہے۔''[۵]

اسی طرح حضرت نوحؔ ناروی فرماتے ہیں:

''.....جتنی خوبیاں ایک باکمال شاعر میں ہونی چاہئیں وہ سب ان میں موجود ہیں۔ ان کی شاعری اپنا مستقبل بہت درخشاں و نمایاں رکھتی ہے۔''[۶]

یہ اقوال شکیلؔ کی شاعری کے سلسلے میں اس وقت کہے گئے کہ جب ان کے فلمی دنیا میں شامل ہونے میں دو سال باقی تھے۔ سبھی حضرات نے شکیلؔ کے فن اور ان کے کلام کی جتنی بھی خوبیاں بیان کی ہیں، ان کا تعلق شکیلؔ کی ادبی شاعری سے ہے۔ فلمی شاعری سے ان کا کوئی رشتہ نہیں اور اُس وقت شکیلؔ کے فلمی دنیا میں داخل ہونے کا کوئی ذکر بھی نہیں تھا۔ اس لیے ان اقوال کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکیلؔ نے بہت جلد اپنے زمانے میں اپنے ابتدائی کلام کی بنا پر بزرگوں کے بیچ ایک خاص پہچان بنالی تھی اِسی لیے اپنے معاصرین میں وہ ممتاز درجہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ان کا یہ ہی رنگ اس وقت بھی باقی رہا کہ جب وہ دو سال بعد فلمی دنیا میں داخل ہوئے اور یہ ہی ان کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنے اس رنگ سخن کو فلمی دنیا میں داخل ہونے کے بعد بھی برقرار رکھا۔ ان کی فلمی شاعری ان کے اسی رنگ سخن کے سائے میں پلی بڑھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فلمی دنیا سے جڑنے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کی توجہ فلمی نغموں کی طرف ہوتی اور وہ اس سلسلے میں کوئی کتاب ترتیب دیتے، مگر دو سال بعد مجموعہ آیا بھی تو ان کی مذہبی شاعری کا جس میں حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، سلام سب کچھ شامل تھا۔ یہاں یہ کوئی بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان سبھی اصناف کا اظہار ادب اور سلیقے کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور یہ دنیا کا سب سے بڑا ادب ہے۔

شکیلؔ کے ادبی کارناموں کا سفر یہیں نہیں ختم ہوتا بلکہ ''نغمۂ فردوس'' کی اشاعت ۱۹۴۸ء کے دو سال بعد ۱۹۵۰ء میں ان کا ایک اور ادبی مجموعہ (صنم وحرم) منظر عام پر آتا ہے۔ اس مجموعے میں کوئی گیت شامل نہیں تھا۔ صرف نعت، سلام، نظمیں اور غزلیں شامل اشاعت تھیں۔ یعنی ۱۹۵۰ء تک شکیلؔ کی وہی حیثیت نظر آتی ہے کہ جو جگرؔ، رشید احمد صدیقی، ماہرؔ القادری، نوحؔ ناروی اور سیمابؔ صاحب نے بتائی تھی یا دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ شکیلؔ ابھی تک اُسی ڈگر پر چل رہے تھے کہ جس کی طرف ان کے بزرگ معاصرین نے اشارہ کیا تھا۔ اس مجموعے کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اس پر مقدمہ حضرت فراقؔ گورکھپوری نے رقم کیا تھا اور تقریظ ساحرؔ لدھیانوی نے لکھی تھی۔

مثلاً فراقؔ صاحب فرماتے ہیں:

''اس مجموعے کو سرسری طور سے پڑھتے ہوئے بھی ایسے اشعار اکثر مل جاتے ہیں جن پر ہم کو تامل کرنا پڑتا ہے۔ ان کے لہجے پر ایک نئی آواز کا گمان ہوتا ہے جو بعض اوقات ہمارے اندر فکر و

جذبات کی عجیب نیم آشنا سی دنیا کو بیدار کرنے لگتی ہے۔

.....ان کی غزل پڑھنے سے یہ اثر ضرور پڑتا ہے کہ غزل گوئی ان کے لیے کوئی وقت طلب امر نہیں ہے۔

.....شکیلؔ کی شاعری میں کچھ منزلیں آتی ہیں کہ وہ بھرپور جوانیوں کی، ولولوں اور حوصلوں کی شاعری بن جاتی ہے۔''[۷]

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکیلؔ کے فلمی دنیا میں داخل ہونے کے ۴ سال بعد کی شاعری فراقؔ صاحب کو ایک نئی آواز معلوم ہوتی ہے اور اُنھیں یہ ولولوں اور حوصلوں کی شاعری نظر آتی ہے۔ بزرگ اساتذہ سے شکیلؔ کے کلام کی اس قدر تعریف سن کر ہمیں شکیلؔ ہی کے لفظوں میں یہ کہنا پڑتا ہے:

ہے ستاروں کی طرح مائل پرواز شکیلؔ
دشمنو تم کو قسم ہے یوں ہی جلتے رہنا

شکیلؔ کے بزرگ معاصرین کو، جو ادبی حیثیت کے مالک ہیں، اُن کے کلام میں اتنی خوبیاں پتہ نہیں کیسے دکھائی دے گئیں۔ کیوں کہ شکیلؔ کے خود کے زمانے میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کے مخالف تھے اور آج بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں، جو بے جا نکتہ چینی کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں شاید یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے مشہور مفکر ایمرسن نے فرمایا تھا کہ ''جو شعر کہنے میں ناکام رہتا ہے وہ اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے تنقید نگار بن جاتا ہے اور شاعروں پر نکتہ چینی کرتا ہے''[۸]۔ خیر چھوڑیے، اب ذرا یہ دیکھیے کہ شکیلؔ کے ہم عمر معاصرین ساحرؔ لدھیانوی کو شکیلؔ، جگرؔ اور فراقؔ کے بعد ہندوستان میں غزل گوئی کے واحد مرد میداں نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''جگرؔ اور فراقؔ کے بعد آنے والی پود میں شکیلؔ بدایونی ہندوستان کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنے فن کے لیے غزل کا میدان منتخب کیا ہے اور اس قدیم مگر جامع اور دل کش صنف سخن کو جس میں ہمارے ماضی کا بہترین ادبی اور تہذیبی اثاثہ محفوظ ہے نہ صرف اپنایا ہے۔ بلکہ اسے زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور جدید تصورات سے ہمکنار کر کے اس میں نئے رنگ بھی بھرے ہیں.... شکیلؔ کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت بیان کی بے پناہ جاذبیت اور احساس کی شدت ہے اور اسی چیز نے انھیں دور حاضر کے شاعروں میں مقبول اور ممتاز بنایا ہے۔''[۹]

یعنی بزرگ تو بزرگ ہم عمر بھی شکیلؔ کے کلام کی خوبیوں کا بیان کیے بغیر نہ رہ سکے۔ راقم ان حضرات کے لیے کہ جن کی نگاہ میں شکیلؔ جچتے نہیں صرف اتنا ہی کہنا چاہے گا کہ یا تو یہ لوگ جگرؔ، فراقؔ، رشید احمد صدیقی، نوحؔ ناروی، ماہرؔ القادری، سیمابؔ اکبرآبادی سے زیادہ قابل اور عظمت والے ہیں یا پھر شکیلؔ ہی کی طرح مذکورہ سبھی حضرات کی بھی ان لوگوں کے نزدیک کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے۔

۱۹۵۸ء میں شکیلؔ کا ایک اور ادبی کارنامہ ''شبستاں'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس بار انھوں نے کچھ گیتوں کے ساتھ کچھ پرانی غزلوں کو بھی شامل کیا، مگر گیت صرف ۱۲ ہی تھے اور غزلوں کی تعداد ۸۲ جو گیتوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء میں ان کا پانچواں ادبی کارنامہ ''دور کوئی گائے'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں گیت صرف ۱۴ ہی تھے اور غزلیں ۸۴، ان غزلوں میں بھی پرانی اور نئی کا امتزاج تھا۔ یعنی ۱۹۶۱ء میں شکیلؔ کو فلمی دنیا میں داخل ہوئے ۱۵ سال ہو چکے تھے اور اب تک ان کے پانچ ادبی کلام کے مجموعے منظر عام پر آ چکے تھے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ صرف ''رعنائیاں'' (۱۹۴۴ء) فلمی شاعری کے آغاز سے پہلے کا ہے باقی سب بعد کے ہیں۔

۱۹۶۱ء میں شکیلؔ کے فلمی نغموں کا پہلا مجموعہ ''دھرتی کو آکاش پکارے'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کا چھٹا مجموعۂ کلام ''رنگینیاں'' ۱۹۶۱ء میں ہی منظر عام پر آیا۔ یہ بھی ایک ادبی کلام کا مجموعہ تھا۔ جس میں غزلیات کی تعداد ۱۱۷ اور گیت صرف ۱۶ ہی شامل تھے، مطلب یہاں بھی غزلوں کی تعداد گیتوں سے کہیں زیادہ رہی۔ اس کے بعد شکیلؔ کے فلمی نغموں کا دوسرا مجموعہ ''کہیں دیپ جلے کہیں دل'' کے نام سے چھپا۔ یہ شکیلؔ کی حیات میں شائع ہوا ان کا آخری مجموعہ تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکیلؔ کی حیات میں ان کے کلام کے ۸ مجموعے شائع ہوئے، جن میں سے ۲ فلمی اور بقیہ ۶ ادبی شاعری کے تھے۔

علاوہ ازیں شکیلؔ کے اُس کلام کو بھی ان کی وفات کے بعد مجموعے کی شکل دی گئی، جو وہ مشاعروں میں پڑھا کرتے تھے۔ اس میں کچھ نیا اور کچھ پرانا کلام بھی، جو کسی نہ کسی مجموعے میں شامل تھا، کچھ اشعار کے اضافے کے ساتھ شامل کیا گیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۶ء میں ''زیبائیاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ مکمل غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس طرح شکیلؔ کے ۷ ادبی کارنامے کتابوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جو کہیں نہ کہیں ان کے فلمی کارناموں سے چار گنا ہیں۔ اسے ادبی جانبداری نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ جس شخص کے ۷ ادبی مجموعے موجود ہوں اور وہ بھی اس کلام کے کہ جس کی تعریف جگرؔ، فراقؔ، ماہرؔ القادری، نوحؔ ناروی، رشید احمد

صدیقی اور سیمابؔ اکبرآبادی نے کی ہو، اسے نظر انداز کیا جائے، بڑی حیرت کی بات ہے اور یہ کوئی بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ یہ سب وہ حضرات ہیں، جو اپنے زمانے میں ایک بلند مقام پر فائز تھے اور ادبی حیثیت کے بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ خیر یہ سب ایک پروپیگنڈہ تھا اور شکیلؔ کو نظر انداز بھی ایک پروپیگنڈے کے تحت ترقی پسند گروہ اور اس تحریک کے مداحوں نے کیا۔ اس کی طرف خود شکیلؔ نے بھی واضح اشارہ کیا ہے۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح حیات ''میری زندگی'' میں ترقی پسند گروہ کی سیاست کے متعلق رقم طراز ہیں:

''.....میں چوں کہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے غیر ترقی پسند سمجھا جاتا تھا اس لیے بمبئی کے ترقی پسند گروہ کو میرے ساتھ دلچسپی نہ تھی، مگر اتنا ضرور ہوا کہ کچھ ترقی پسند قریبی دوستوں نے میری ہمت افزائی کی۔''[10]

آج بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں ہے۔ شکیلؔ کی شہرت، عظمت اور ان کے فن سے جلن وحسد رکھنے والوں کی کمی نہ ان کے خود کے دور میں تھی اور نہ آج ہے۔ شکیلؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے زمانے کے مخالفین کو تو خوب جوابات دیے تھے۔ ان کے یہ جوابات آج کے دور کے مخالفین کے لیے بھی موزوں ہیں۔ اِس زمانے کے مخالفین یعنی آج کے دور کے حضرات دراصل ان لوگوں میں سے ہیں کہ جنھوں نے آج تک خود اپنا تو ایک بھی شعر نہ کہا، دوسروں کا کلام پڑھ پڑھ کر شاعر بن گئے ہیں اور دوسروں کے کلام پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ راقم دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ ان حضرات سے شکیلؔ کی فلمی شاعری کے ہی کسی بھی ایک نغمے کے مصرعہ کے وزن کا مصرعہ نہ ہو پائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو شکیلؔ کی شہرت و عظمت سے جلن وحسد رکھتے ہیں کہ انھیں کیسے اتنی ترقی مل گئی ہمیں کیوں نہیں ملی۔ درحقیقت یہ حضرات احساس کمتری کا شکار ہیں۔ انھیں یہ لگتا ہے کہ جس بلندی کو شکیلؔ نے چھولیا ہے اور جو عظمت وشہرت پائی ہے اب وہاں تک ہم کبھی نہیں پہنچ پائیں گے۔ ان حضرات کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ شکیلؔ نے فلمی شاعری میں بھی وہ مصرعہ کہہ دیا ہے جو آج کا ادبی شاعر نہیں کہہ پا رہا ہے۔ پھر بھی یہ حضرات نکتہ چینی کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ شاید کچھ وہم وگمان ہو کہ ہم ادیب ہیں، نقاد ہیں یا شاعر۔ اگر ہم ان حضرات کو شاعر، نقاد اور ادیب مان بھی لیں تو یہ ادب کے ساتھ بھی کہاں انصاف کر پاتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ شکیلؔ کا ذکر آتے ہی کچھ لوگوں کے منھ پر فوراً یہ جملہ آجاتا ہے کہ ''شکیلؔ شاعر نہیں تھا۔'' راقم کا جب ایسے ہی کچھ حضرات سے سامنا ہوا تو اس کو خیال ہوا، بھئی ہوسکتا ہے کہ ان حضرات کی شخصیت بہت بلند ہو کہ جو کلام کا مطالعہ کیے بغیر دوٹوک فیصلہ سنا دیں اور ہوسکتا ہے یہ آج کے زمانے کے ادیب ہوں، نقاد ہوں یا پھر شاعر، مگر شکیلؔ کے زمانے میں کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو حقیقتاً ادبی حیثیت کے مالک تھے مثلاً جگرؔ مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، ماہرؔ القادری، نوحؔ ناروی، سیمابؔ اکبرآبادی کہ جنھیں شکیلؔ کے کلام میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آئیں اور نہ جانے کتنی خصوصیات بھی گنا دیں اور تو اور جگرؔ تو یہاں تک کہہ گئے کہ وہ اس شخص کو اصل معنوں میں شاعر ماننے کو تیار ہیں کہ جو شکیلؔ کے ابتدائی کلام کے جیسے اشعار زندگی بھر میں کہہ دے۔ جگرؔ صاحب کا دعویٰ بہت بڑا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک ایسے شاعر کے کلام کہ جس کی شاعری کی عمر ابھی صرف ۱۳ سال ہی تھی، کے بدلے میں زندگی بھر کا وقت دے رہے ہوں، مگر قابل غور بات یہ ہے کہ جگرؔ صاحب کو یہ حوصلہ ملا بھی تو اسی کلام کی فنی خوبیوں سے تھا کہ جس کی بنا پر وہ اتنا مضبوط دعویٰ کر رہے تھے۔ خیر چھوڑیے چاند پر خاک کس نے ڈالی ہے۔ اخیر میں ہم شکیلؔ کے ہی کچھ اشعار اِن حضرات کی نذر کرنا چاہیں گے۔

ملاحظہ کریں:

ہر لحظہ نا تمام ہے روداد غم شکیلؔ
اہل نظر کو فرصت نقد و نظر کہاں

شکیلؔ احساس گمنامی سے کہہ دو
کہ ہم مشہور ہوتے جا رہے ہیں

اپنے سوا کسی کو بھی داد ہنر نہ دی
انساں ہے جس کا نام بڑا خود پسند ہے

اپنے ہم عصروں میں شکیلؔ کی مقبولیت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے ان میں سب سے کم عمر پائی اور شاعری بھی صرف ۳۰ سال کے آس پاس (پہلی غزل کی اشاعت ۱۹۳۱ء سے ۱۹۶۱ء تک) کی۔ شکیلؔ نے ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔ ان کے معاصرین رازؔ، خمارؔ، مجروحؔ اور ساحرؔ نے ان کی وفات کے کئی سال بعد تک شاعری کی مگر پھر بھی شکیلؔ کی غزلیات کی تعداد ان سبھی حضرات سے کہیں زیادہ ہے اور ایسا بھی نہیں کہ بے وجہ کہتے چلے گئے۔ بلکہ ہر ایک غزل میں ایک نیا رنگ، نیا خیال موجود ہے۔ اگر ہم ان کے شعری مجموعوں کی اشاعت پر نظر ڈالیں تو پہلا ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا اور ۱۹۶۱ء تک تقریباً ان کے سبھی مجموعے صرف ایک آدھ کو چھوڑ کر منظر عام پر آچکے تھے۔ یعنی باقاعدہ طور پر ان کی شاعری کی عمر صرف ۳۰ سال رہی اور ان تیس سالوں میں اتنا ضخیم مجموعہ ''کلیات شکیلؔ''

کہ جس میں غزلیات، نظمیں، نغمے، رباعیات، قطعات، حمد، نعتیں، منقبتیں، سلام اور مرثیہ غرض یہ کہ سبھی کچھ ہے۔

بہر حال راقم الحروف کے نزدیک شکیلؔ کی شاعری کی زبان سادہ و سلیس ہے۔ بیان میں سادگی وصفائی ہے۔ اظہار بیان پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں سہل ممتنع بھی ہے سوز و گداز بھی۔ معاملہ بندی بھی ہے نازک خیالی بھی۔ ان ساری خوبیوں کے باوجود راقم کو ان کے کلام میں کوئی کمی نظر نہیں آتی اور اگر کسی نقاد کو ان کے یہاں فنی غلطیاں مل بھی جاتی ہیں تو راقم دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کی غلطیاں اردو کے ہر شاعر کے یہاں مل جائیں گی۔ شکیلؔ آخر انسان ہی ہیں کوئی فرشتہ نہیں۔

اہل نظر کی چشم تعصب اہل ہنر کا رشک شکیلؔ
تونے جو کی ہے خدمت اردو اس کے یہ نذرانے ہیں

حواشی

۱۔ ''مقدمہ'' از جگرؔ مرادآبادی مشمولہ ''رعنائیاں''، شکیلؔ بدایونی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، ۱۹۴۴ء، ص:۸، ۹

۲۔ ''تقریظ'' از رشید احمد صدیقی مشمولہ ''رعنائیاں''، شکیلؔ بدایونی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، ۱۹۴۴ء، ص:۱۲

۳۔ ''تقریظ'' از ماہر القادری مشمولہ ''رعنائیاں''، شکیلؔ بدایونی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، ۱۹۴۴ء، ص:۱۳

۴۔ ''تقریظ'' از سیمابؔ اکبرآبادی مشمولہ ''رعنائیاں''، شکیلؔ بدایونی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، ۱۹۴۴ء، ص:۱۳

۵۔ ''تقریظ'' از سیمابؔ اکبرآبادی مشمولہ ''رعنائیاں''، شکیلؔ بدایونی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، ۱۹۴۴ء، ص:۱۴

۶۔ ''تقریظ'' از رشید احمد صدیقی مشمولہ ''رعنائیاں''، شکیلؔ بدایونی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی، ۱۹۴۴ء، ص:۱۵

۷۔ ''مقدمہ'' از فراقؔ گورکھپوری مشمولہ ''صنم وحرم''، شکیلؔ بدایونی، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۰ء، ص:۸، ۱۱، ۱۸

۸۔ فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۳ء، ص:۱۱

۹۔ ''تقریظ'' از ساحرؔ لدھیانوی مشمولہ ''صنم وحرم''، شکیلؔ بدایونی، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۰ء، ص:۲۲

۱۰۔ میری زندگی، شکیلؔ بدایونی، دبستان بدایوں کراچی (پاکستان)، جنوری ۲۰۱۴ء، ص:۴۱

○○


# ابن صفی: شخصیت اور فن کے آئینے میں

اردو ادب میں ابن صفی کی گراں قدر خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں مگر ان کی خدمات کا اعتراف بہت کم ہوا ہے۔ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام ذہنی تحفظات سے بلند ہو کر معروضی انداز میں ان کے ادبی مقام کا تعین کیا جائے تاکہ نئی نسلیں ان کی تخلیقی فتوحات سے واقف ہو سکیں اور ان کے لائقِ رشک طرزِ نگارش، غیر معمولی حسِ مزاح، ذہانت، ذکاوت اور حیرت انگیز زود نویسی کے باوصف فکر و فن کی تازگی کو برقرار رکھنے کی زبردست صلاحیت کا ادراک و احساس کر سکیں۔ ایسے ہر دلعزیز تخلیق کار کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کے لیے اردو اکادمی، دہلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس سمینار کے بیس فکر انگیز مقالات پر مشتمل یہ کتاب قارئین کے لیے مفید مطلب بھی ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی۔

مرتبین: خالد محمود، خالد جاوید، صفحات: ۲۴۸، قیمت: ۱۵۰ روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی